۵۶

مسلمانوں کی ترقی کے دو گُر

(فرمودہ ۲۷/ جولائی ۱۹۲۸ء بمقام ڈلہوزی)

تشہد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف:۱۰۹) اس کے بعد فرمایا رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں دو امور کا اعلان کرنے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ گویا رسول کریم ﷺ کا دعویٰ دو نہایت چھوٹے سے جملوں میں بیان فرماتا ہے اور دنیا کو اس کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ پہلی آیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ کہہ دے یہ جو کچھ پہلے بیان ہُوا ہے یہ میرا طریق اور راستہ ہے۔ چونکہ ہر انسان لمبے مضمون سے نتیجہ نکالنے کے قابل نہیں ہوتا اور جہاں بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تھوڑی عقل اور محدود سمجھ والوں کے لئے اجمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس لئے پہلی آیات کے بعد فرمایا هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ - وہ رستہ جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ تو رسول کریم ﷺ سے فرمایا کہہ دے میرا یہ راستہ ہے جو پہلے بیان ہُوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ سَبِيْلِيْ کہہ کر پہلی بات یہ بیان کی کہ میں اس رستہ پر عامل ہوں صرف یہ نہیں کہ لوگوں کو اس کی طرف بلاتا ہوں بلکہ خود بھی اس پر عمل کرتا ہوں۔ پہلی چیز ایک مدعی کے لئے یہ ہوتی ہے کہ جس بات پر عمل کرنے کے لئے دوسروں سے کہتا ہو پہلے خود اس پر عامل ہو۔ اگر ایک شخص لوگوں کو ایک بات کی طرف بلاتا ہے مگر خود اس پر عمل نہیں کرتا تو اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ہر انسان جو اس کی بات سنے گا یہی سمجھے گا کہ اگر اس بات میں خوبی ہوتی تو یہ خود بھی

اس پر عمل کرتا- پس اگر کوئی شخص اعلیٰ اخلاق سکھائے اچھے معاملات کی تلقین کرے اور فلسفیانہ باتیں بتائے لیکن خود ان کو رد کرتا جائے تو وہ کبھی نیکی پھیلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا- اگر ہم لوگوں سے کہتے ہیں کہ خدا کی طرف آؤ' خدا کے دین کے لئے قربانیاں کرو' اپنی قوم کے لئے قربانی اور ایثار دکھاؤ تو ضروری ہے کہ اپنے عمل سے بھی ان باتوں کا ثبوت دیں- زبان با اثر اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ انسان وہ کام خود بھی کرے جس کے کرنے کے لئے دوسروں سے کہے- اگر دوسروں سے تو کہے کہ قوم یا مذہب یا جماعت کی خاطر اولاد کو قربان کرو مگر خود اولاد کو ایسے رستہ پر لگائے جس سے دنیا کا فائدہ حاصل ہوتا ہے تو اس کی بات کا کیا اثر ہوگا- اسی طرح جو شخص دوسروں سے کہے کہ خدا سے محبت کرو مگر آپ خدا کی محبت میں نہیں بلکہ دنیا کی محبت میں چُور ہو تو ایسے انسان کی بات کا کیا اثر ہوگا- تو فرمایا ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْ اس میں صرف یہ نہیں بتایا کہ میں کس طرف بلاتا ہوں بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ جس طرف میں بلاتا ہوں اس طرف خود بھی جا رہا ہوں- پس اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کا نہ صرف دعویٰ پیش کیا ہے بلکہ آپ کا عمل بھی پیش کر دیا ہے- اور وہ رستہ یہ ہے اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ اللہ کی طرف بلاتا ہوں- یہ ایک امتیازی نشان ہے رسول کریم ﷺ کی فضیلت کا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے ہیں- میں یہ نہیں کہتا کہ باقی انبیاءؑ خدا کی طرف نہ بلاتے تھے بلاتے ہوں گے مگر ان کی تعلیمیں چونکہ منسوخ ہو گئی ہیں ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ کرتے تھے- توریت پڑھنے سے انسان اس بات سے تو متأثر ہوتا ہے کہ اس میں ایک حد تک خدا کی طرف بلایا گیا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قومیت اور جتھہ بندی کی طرف زیادہ توجہ دلائی گئی ہے اور یہ سکھایا گیا ہے کہ تم ساری دنیا سے معزز قوم ہو' سب سے ممتاز ہو' ساری خوبیاں تم میں جمع ہیں- گویا یہودیوں کی جتھہ بندی پر سارا زور صرف کیا گیا ہے- میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یقیناً حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ تعلیم نہ ہوگی لیکن بہرحال ان کی طرف جو منسوب کی جاتی ہے وہ ایسی ہے اور اس کے سوا کوئی اور ایسی تعلیم نہیں ہے جو ان کی بتائی جاتی ہو-

پھر انجیل کو دیکھتے ہیں تو اس میں بھی اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ کی سپرٹ نظر نہیں آتی- اس میں سارا زور اپنی قوم کو ابھارنے ان کی امیدیں قائم کرنے یا پھر اپنی ذات کی طرف توجہ دلانے پر ہے- میں نہیں سمجھتا حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی تعلیم دی ہو مگر بہرحال ہمارے

سامنے جو کچھ ہے وہ یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر زور دینے والی کتاب زبور ہے اسی لئے زیادہ تر عیسائی اپنے وعظوں میں زبور کو پیش کرتے اور اس پر زور دیتے ہیں۔ جتنے مشہور عیسائی واعظ ہیں وہ زبور کی آیات پڑھ کر ان پر اپنے وعظ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اس میں خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے مگر وہاں بھی اُدْعُوْآ اِلَی اللّٰہِ والی بات نظر نہیں آتی۔ حضرت داؤدؑ یہ نہیں بیان کر رہے کہ اللہ کی طرف آؤ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں اللہ کی طرف جا رہا ہوں اور ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک کا تو یہ مطلب ہے کہ اپنی ذات کا فائدہ اٹھاؤ اور دوسری کا یہ ہے کہ اپنی ذات کا ہی فائدہ نہ اٹھاؤ بلکہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچاؤ۔ تو زبور میں بے شک محبت الٰہی کا ذکر ہے مگر وہ صرف حضرت داؤدؑ سے مخصوص ہے اُدْعُوْآ اِلَی اللّٰہِ نہیں ہے۔ مگر قرآن کی جس سورۃ جس رکوع اور جس آیت کو دیکھو اس میں یہی نظر آئے گا کہ خدا تعالیٰ کو پیش کیا گیا اور ساری دنیا کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ یعنی سب کو اس کی طرف جانے اور اس سے فیض حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ قرآن کریم کی اتنی بڑی خوبی ہے جو مخالفین کو بھی متأثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے میں نے پادریوں کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ قرآن ایک جھوٹی کتاب ہے اس وجہ سے مجھے اس کے پڑھنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن جب میں نے قرآن پڑھا تو ایک بات نے مجھے مجبور کر دیا کہ اسے جھوٹا نہ کہوں اور وہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی جھوٹ بولتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ وہ یا تو روپیہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا قوم کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے یا ذاتی طور پر کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ غرض کوئی نہ کوئی اس کی غرض ہوتی ہے۔ میں نے قرآن کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھا ہے مگر کوئی مقصد ایسا نہ نظر آیا۔ اگر اس میں ایسی تعلیم دی جاتی جس سے محمد (ﷺ) کے پاس دولت جمع ہو جاتی یا ان کو حکومت حاصل ہو جاتی یا ان کی قوم کو دوسروں پر برتری دی جاتی یا کوئی اور ذاتی یا قومی فائدہ حاصل کرتا تو میں سمجھتا اس شخص نے فلاں غرض کے لئے جھوٹ بولا ہے مگر قرآن میں ایسی باتوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتی بلکہ شروع سے آخر تک یہی ذکر ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرو' اس کی رضا حاصل کرو' اس کے حکم کے خلاف کوئی بات نہ کرو' اس کا قرب حاصل کرو اور جب ہم اس انسان کی ذات کی طرف دیکھتے ہیں جس نے یہ باتیں بیان کیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو کام بھی وہ شروع کرتا ہے خدا کا نام لے کر شروع کرتا ہے اسے ہم جھوٹا تو نہیں کہہ سکتے۔ اگر اس کا نام جنون رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اسے خدا

کی محبت کا جنون تھا۔

یہ ایک غیر کی گواہی ہے اور اس شخص کی گواہی ہے جس نے قرآن کریم کو اس نظر سے دیکھا کہ اس کی قوم کے لوگ قرآن کو جھوٹا کہتے تھے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قرآن بھی کہتا ہے۔ اُدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ اور ایک غیر شخص جس میں تعصب نہ تھا وہ بھی یہی کہتا ہے کہ اگر بانی اسلام کو کوئی جنون تھا تو وہ خدا کی محبت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ تو فرمایا یہ رستہ ہے جس کی طرف میں بلاتا ہوں اور وہ خدا کی طرف جانے کا رستہ ہے۔

اب قرآن کریم کے اس مضمون اور دوسری مذہبی کتب کے مضمون کو دیکھو کتنا بڑا فرق نظر آتا ہے۔ رسول کریم ﷺ قرآن کریم شروع کرتے ہیں تو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے اور ختم کرتے ہیں۔ تو قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِىْ يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ پر یعنی خدا تعالیٰ کا نام لے کر شروع کرتے ہیں خدا ہی کے سپرد کر کے ختم کرتے ہیں۔ مگر انجیل کو دیکھو کس طرح شروع ہوتی ہے۔ فلاں سے فلاں پیدا ہوا اور فلاں سے فلاں۔ اس کا خدا تعالیٰ سے ملنے اور اس کا قرب حاصل کرنے سے کیا تعلق؟ اور پھر ختم ہوتی ہے تو اس طرح کہ حضرت مسیح نہایت مایوسی اور بے قراری کی حالت میں صلیب پر لٹکائے جاتے اور بالفاظ انجیل مار ڈالے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ انجیل نے اپنے اول اور آخر جو کچھ پیش کیا ہے وہ قرآن کریم کے مقابلہ میں بہت ادنیٰ ہے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع ہوتا ہے اور اللہ ہی کے نام پر ختم ہوتا ہے۔ گویا اللہ ہی کے نام سے برکت حاصل کر کے شروع کیا جاتا ہے اور اللہ ہی کے سپرد کر کے ختم کیا جاتا ہے۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کی سورتوں کا خلاصہ کیا ہے صرف یہ کہ

سپردم بتو مایۂ خویش را۔ تو دانی حساب کم وبیش را

میں نے تیرا نام لے کر کام شروع کیا تھا اور نیت یہی تھی کہ تجھے ہر بات میں مقدم رکھوں اور تیرے لئے اپنے آپ کو مٹا دوں اس نیت کے ساتھ میرا کام ختم ہوتا ہے۔ مگر میں یہ مانتا ہوں کہ مجھ سے غلطیاں ہوئیں، کوتاہیاں ہوئیں اس لئے اپنی جان تیرے سپرد کرتا ہوں۔ اب جو تو چاہے وہ کر۔

کیسی محبت کی اور کتنی درد کی تعلیم ہے۔ محبت ہے تو ایسی کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہنے کے بغیر کوئی کام ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ کمال محبت ہے کہ کسی چیز کو چھونا بھی نہیں چاہتا جب تک خدا کا نام نہ لے لے جیسے ماں ہر چیز کھانے کے وقت بچہ کو یاد کر لیتی ہے اسی طرح مؤمن ہر کام کرنے کے وقت خدا کو یاد کرتا ہے۔ پھر اس محبت سے وہ سوز اور گداز پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے بالکل بے جان کی طرح خدا تعالیٰ کے سامنے ڈال کر کہتا ہے جو کچھ کرنا ہے تو نے ہی کرنا ہے۔

یہ وہ تعلیم ہے جو رسول کریم ﷺ نے پیش کی اسے کون غلط کہہ سکتا ہے۔ مذہب کی غرض خدا تعالیٰ سے ملنا ہے اور جو خدا تعالیٰ کی طرف چل پڑے وہ غلط رستہ پر کہاں جا سکتا ہے۔ تو اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ میں یہ بتایا کہ مذہب کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہے انسان کو چاہئے کہ اس میں زندگی بسر کرے۔ یہ بہت اعلیٰ طریق ہے مگر اس میں ایک کمی رہ جاتی ہے اس کی طرف آیت کے اگلے حصہ میں توجہ دلائی گئی ہے۔ محبت بے شک اچھی چیز ہے مگر یہ ایسی چیز ہے کہ اس میں ٹھوکر بھی لگ سکتی ہے۔ بہت لوگ محبت کی وجہ سے حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ پس خالی محبت مفید نہیں ہو سکتی محبت اور حقیقت مل کر کام آتی ہے۔ مثلاً اگر کسی کا بچہ پہاڑ پر سے گر پڑے تو بجائے اس کے کہ سوچ کر نیچے اترے۔ اگر وہ محض محبت کے جوش میں پہاڑ سے کود پڑے گا تو ہو سکتا ہے کہ بچہ تو صحیح سلامت نیچے کھڑا ہو اور وہ مر جائے تو فرمایا:۔ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ میں خدا سے محبت کرتا ہوں اور اس کی طرف بلاتا ہوں مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کہتے ہیں بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے اسے مان لو بلکہ میں یہ کہتا ہوں عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ میں اور میرے پیچھے چلنے والے ایسے ہیں کہ انتہاء درجہ کی محبت میں بھی ان کی عقلیں نہیں ماری جاتیں بلکہ قائم رہتی ہیں کیونکہ میری تعلیم کی بنیاد عقل اور دلیل پر قائم ہے۔ نیک نیت بے شک قابل قدر چیز ہے لیکن جب عقل کے خلاف ہو تو نقصان پہنچاتی ہے۔ اگر ایک شخص زہر کو تریاق سمجھ کر کھالے تو وہ اپنی نیت کے اچھے ہونے کی وجہ سے بچ نہیں سکے گا یا لوگ کشتے تیار کرتے ہیں اگر کوئی زہر کا کشتہ کسی کے لئے بڑی محبت اور اخلاص سے تیار کرے مگر وہ زہر کا اثر زائل کرنا نہ جانتا ہو تو اس کی محبت اور نیک نیتی کی وجہ سے وہ کشتہ کے زہر سے بچ نہیں سکے گا کیونکہ وہ عقل کے ماتحت تیار نہ ہؤا ہو گا۔

تو اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ میں بتایا کہ اسلام کی بنیاد محبت پر ہے مگر ساتھ ہی اسلام عقل کو بھی

نہیں چھوڑتا اس لئے میں بھی عقل پر قائم ہوں اور میرے متبع بھی۔

پھر فرمایا۔ وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ یہ پہلی دونوں باتوں کی دلیلیں دیں۔ قرآن کریم کا قاعدہ ہے کہ بات کے آخر میں ایک یا دو لفظوں میں خلاصہ بیان کر دیتا ہے۔ یہاں دو دعوے پیش کئے گئے تھے اور خاتمہ پر دو لفظوں میں ان کا ثبوت بیان کر دیا۔ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ کے متعلق سُبْحٰنَ اللّٰہِ فرمایا کہ اللہ ہر قسم کے عیوب سے پاک ہے اور کامل ذات ہے۔ ادعوا الی اللہ میں بتایا تھا کہ میں خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ اس پر سوال ہو سکتا تھا کہ کیوں خدا کی طرف جائیں اس میں کیا فائدہ ہے۔ اس کے متعلق فرمایا۔ سُبْحٰنَ اللّٰہِ وہ ذات کامل اور پاک ذات ہے اگر تم کامل بننا چاہتے ہو تو کامل ذات کی طرف آؤ۔ یہ فطرتی تقاضا ہے کہ جو کام کیا جائے اس کا کوئی مقصد ہونا چاہئے اور خدا کی طرف جانے کا مقصد یہی ہے کہ کمال حاصل ہو اور یہ خدا ہی سے حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی کامل نہیں ہے۔ اس لئے بتایا۔ سُبْحٰنَ اللّٰہِ اللہ تمام عیوب سے پاک اور تمام خوبیوں کا جامع ہے اور وہی کامل ہے اس لئے اسی کی طرف جانے سے کمال حاصل ہو سکتا ہے۔

دوسری بات جو یہ کہی تھی کہ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ اس کے متعلق فرمایا۔ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ دلائل پر قائم ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ادھر ادھر نہیں مارا مارا پھرتا اس کے سامنے ایک گول اور مقصد ہوتا ہے تمہاری بھی یہی حالت ہو جائے گی۔ مشرک کون ہوتا ہے وہ کہ جو چیز دیکھتا ہے اسے اپنا معبود بنالیتا ہے۔ اگر پہاڑ دیکھا تو اس کے آگے جھک گیا' دریا دیکھا تو اسے پوجنے لگ گیا' کوئی درندہ ملا تو اسے معبود بنالیا گویا وہ ایک آوارہ گرد کی طرح ہوتا ہے یہ نہیں جانتا کہ خدا کس طرف جانے سے مل سکتا ہے۔ مگر مؤمن اس طرح نہیں کرتا اس کے سامنے ایک کامل اور واحد ذات ہوتی ہے اور وہ اس کے پانے کے لئے کوشش کرتا ہے۔ پس مؤمن اور مشرک میں فرق یہ ہے کہ مؤمن کی مثال اس معالج کی طرح ہوتی ہے جو سائنٹیفک طریق پر علاج کرتا ہے جو مرض دیکھتا ہے اور اس کے مطابق دوا دیتا ہے۔ مگر مشرک پرانے زمانہ کی اس بڑھیا کی طرح ہوتا ہے جسے جو شخص کوئی علاج بتائے وہی کرنے لگ جاتی ہے۔ غرض مشرک ہمیشہ بصیرت کے خلاف چلتا ہے وہ اپنے اعمال کی بنیاد عقل پر نہیں رکھتا اس لئے کبھی کسی طرف اور کبھی کسی طرف نکل جاتا ہے۔ دیکھو وہ لوگ جو ڈلہوزی پہنچنے کا رستہ جانتے ہوں وہ تو چلتے چلتے ڈلہوزی پہنچ جائیں گے مگر جو رستہ نہیں جانتے ان میں سے کوئی کہیں

نکل جائے گا اور کوئی کہیں۔ پس عقل کے ماتحت جو کام کرتے ہیں وہ ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ اور جو یونہی چلتے ہیں ان میں سے بھی کوئی پہنچ سکتا ہے مگر زیادہ ضائع ہی ہو جاتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ نے اس آیت میں دو دعوے کئے۔ ایک یہ کہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ اور دوسرا یہ کہ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ اس سے بہتر دعوے نہیں ہو سکتے اور نہ کسی نے آپ کے سوا کئے ہیں۔ دعوے یہ ہیں کہ میں خدا کی طرف بلاتا ہوں، خدا کی محبت لوگوں میں پیدا کرتا ہوں، پھر عقل سے منواتا ہوں کسی قسم کا جبر نہیں کرتا۔ یہ وہ بہترین چیز ہے جو قرآن کریم نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ مگر ہمارے لئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔ خواہ ایک چیز کتنی عمدہ ہو لیکن اگر ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو ہمارے لئے اس کا اچھا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ کسی کو بخار چڑھا ہو اور اس کی جیب میں کونین بھی ہو مگر وہ خود نہ کھائے اور دوسروں کو بتائے کہ بخار دور کرنے کے لئے بہت مفید چیز ہے تو اس سے اسے کیا فائدہ ہو گا۔ اسی طرح ایک شخص کنویں کے پاس پیاسا بیٹھا ہو مگر پانی نہ پئے تو اس کی پیاس کس طرح بجھ سکی گی۔ پس جب تک ہم قرآن کریم پر عمل نہ کریں وہ باتیں جو اس میں بیان کی گئی ہیں ان سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس آیت میں قرآن نے دو باتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ چاہئے کہ کیا ہماری زندگیاں ایسی ہیں کہ ہم لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف بلاتے ہیں یا یہ کہ دوسروں کو بلانا تو الگ رہا خود ہی خدا کی طرف جاتے ہیں۔ اگر غور کریں تو مسلمانوں میں سے بہت کم ہوں گے جو اس طرف توجہ کرتے ہوں۔ ان کے مقابلہ میں عیسائی اور دوسرے مذاہب والوں میں اپنے اپنے مذہب سے بہت زیادہ تعلق پایا جاتا ہے اور وہ دوسروں کو بھی اپنے مذاہب کی طرف لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت انگلستان میں دہریت کا بہت زور ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ دہریت نے عیسائیت کو بہت بگاڑ دیا ہے مگر باوجود اس کے ان لوگوں کو حضرت عیسیٰؑ سے جو وابستگی ہے اس میں فرق نہیں آیا۔ وہ لوگ اس بات کو مذہب سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ سے محبت اور اخلاص رکھیں اور اسے چھوڑنے کے لئے وہ کسی صورت میں بھی تیار نہیں خواہ وہ عیسائی رہیں یا نہ رہیں دہریہ بن جائیں یا کچھ اور حضرت عیسیٰؑ سے انہیں جو تعلق ہے اس میں کمی آنے نہیں دیتے۔ اس میں وہ ایسے پختہ ہیں کہ عیسائیت کی تبلیغ کے مرکز آکسفورڈ اور کیمبرج سمجھے جاتے ہیں جہاں یونیورسٹیاں ہیں اور جہاں نوجوان تعلیم

پاتے ہیں ہمارے بعض دوست وہاں گئے تو انھیں اس قسم کا لٹریچر ملا جو عیسائیت کی تبلیغ کے لئے شائع کیا گیا تھا- وہاں انجمنیں بنی ہوئی ہیں جو سوالات بنا کر شائع کرتی ہیں اور لوگوں سے جواب حاصل کرتی ہیں وہ سوالات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جواب دینے والے مجبور ہوتے ہیں کہ عیسائیت سے محبت کا اظہار کریں۔

اس کے مقابلہ میں ہمارے کالجوں کے طلباء کو دیکھو وہ کیا کرتے ہیں- یہی نہیں کہ دوسروں کو اسلام کی طرف متوجہ نہیں کرتے بلکہ خود ان کے دلوں میں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں- بے شک اس کی ذمہ داری علماء پر پڑتی ہے کہ کیوں انھوں نے اسلام کو ایسے رنگ میں پیش کیا جس سے اعتراض وارد ہوتے ہیں مگر اعتراض کرتے تو نوجوان ہی ہیں- پھر ان کی توجہ اسلامی احکام کی تعمیل کی طرف نہیں- ہزار میں سے پانچ سات نماز پڑھتے ہوں تو پڑھتے ہوں باقی نہیں- ادھر عیسائیوں کو دیکھو ان کا مذہبی جوش دیکھ کر لطف آجاتا ہے جہاں مسلمانوں کی مذہبی حالت دیکھ کر رقت پیدا ہوتی ہے- جب یورپ میں جنگ عظیم جاری تھی تو ایک موقع پر فریقین نے انتہائی زور صرف کر دیا کیونکہ ہر ایک چاہتا تھا کہ اس سال لڑائی کا خاتمہ ہو جائے اس کے لئے بڑا سامان جمع کیا گیا اور ہر فرد جو بھی مل سکتا تھا اسے میدان جنگ میں لایا گیا- نہایت زبردست جنگ شروع ہوئی- اس وقت انگلستان کی جنگی کمیٹی کو تار پہنچا کہ اس وقت ہماری یہ حالت ہے کہ ہم دیوار سے پیٹھ لگا کر لڑ رہے ہیں اگر اس وقت ہم ذرا بھی ہل گئے تو کہیں ہمارا ٹھکانا نہ رہے گا- اس وقت کیبنٹ میٹنگ ہو رہی تھی اور مشورہ کیا جا رہا تھا کہ لڑائی کے لئے کیا کیا سامان جمع کیا جائے اور کہاں کہاں بھیجا جائے کہ یہ تار پہنچا- لائڈ جارج اس وقت وزیر اعظم تھے وہ تار لے کر کھڑے ہو گئے اور سب کو مخاطب کر کے کہنے لگے یہ تار آیا ہے اب باتوں کا وقت نہیں رہا اور اب وہ ایک ہی طریق اختیار کریں جو باقی رہ گیا ہے اور جس کے بغیر اور کوئی طریق نہیں ہے اور وہ یہ کہ خدا کے آگے جھک جائیں اور اس سے دعا کریں کہ ہم کامیاب ہوں- یہ کہہ کر سب کے سب جھک کر دعا کرنے لگ گئے۔

یہ اس قوم کی حالت ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے خدا کو چھوڑ دیا جو مذہب ترک کر چکی ہے اور جو حقیقت مذہب سے ایسی ہی ناواقف ہے جیسے جانور فلسفہ سے ناواقف ہوتا ہے- یہ سب کچھ صحیح مگر باوجود اس کے اس میں ایک چیز قائم ہے اور وہ مذہب کا ادب ہے- باوجود اس کے کہ ان کا مذہب ان کی تسلی نہیں کر سکتا اور باوجود اس کے کہ ان کی دعاؤں میں

قبولیت کا رنگ نہیں ہوتا وہ خدا کی بتلائی ہوئی دعائیں نہیں کرتے بلکہ اپنی عقل سے بنائی ہوئی کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان میں اپنے مذہب کا ادب اور احترام پایا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ مذہبی باتوں پر ٹھٹھا کرتے ہیں اور ان پر عمل کرنے والوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یہودی مذہب کی حقیقت سے کس قدر دور ہو چکے ہیں لیکن باوجود اس کے میں نے ان کو دیکھا ہے دعائیں کرتے وقت عملاً ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ آج تک جب کبھی مجھے وہ نظارہ یاد آجاتا ہے تو میرا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ میں نے یہودیوں کی اپنی مذہب سے جو تڑپ دیکھی وہ بہت ہی درد انگیز تھی۔

یروشلم میں ایک مسجد ہے۔ وہ مقام یہودیوں کے لئے ایسا ہی متبرک ہے جیسا ہمارے لئے خانہ کعبہ۔ مسلمانوں کے زمانہ میں جب یروشلم فتح ہؤا تو عیسائیوں نے چاہا کہ حضرت عمرؓ اس مقام کے اندر آکر نماز پڑھیں مگر آپ نے فرمایا میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اندر نماز پڑھی تو مسلمان اس جگہ کو اپنی عبادت گاہ بنالیں گے اور آپ نے باہر نماز پڑھی۔ [۳] وہ مقام یہودیوں سے رومیوں نے چھین لیا تھا اور پھر ان سے عیسائیوں کے قبضہ میں آیا تھا اب اس مقام کو یہودیوں کے ہاتھ سے نکلے اٹھارہ سو سال کے قریب ہو چکے ہیں لیکن آج تک ہر جمعہ کے دن وہ لوگ اس مسجد کے پاس جاتے اور اس کی دیوار کو پکڑ کر چیخیں مار مار کر روتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں کہ خدایا یہ مسجد ہمارے حصہ میں آجائے۔

میں سمجھتا ہوں یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان دنوں میں جن میں وہاں میں ٹھہرا جمعہ کا بھی دن تھا اور مجھے وہ نظارہ دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے جاکر دیکھا کہ بچے بوڑھے عورتیں اور مرد بلک بلک کر رو رہے تھے اور دعائیں کر رہے تھے۔ میں اس کیفیت کو نہیں بھول سکتا کہ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی دونوں ہاتھوں سے دیوار کے ساتھ چمٹ کر اور زبان اس کے ساتھ لگا لگا کر اس بے تابی اور اضطراب کے ساتھ رو رہی تھی کہ خیال ہوتا تھا اسے ہسٹیریا کا دورہ پڑا ہؤا ہے اور اس وجہ سے اسے سر پیر کی ہوش نہیں ہے۔

اسی طرح میں نے ایک بڈھے کو دیکھا جس کی عمر نوے سال کے قریب ہوگی اس کی کمر ٹیڑھی ہو چکی تھی وہ کمزوری کی وجہ سے کھڑا نہ ہو سکتا تھا اس کی داڑھی ناف تک لمبی تھی وہ بے اختیار ہو ہو کر اس طرح گرا پڑتا تھا کہ گویا ابھی اس کا اکلوتا بیٹا مرا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اس کے ہاتھ لٹکے ہوئے تھے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اس کا تمام

جسم جذبات کی زندہ تصویر بنا ہوا تھا اور وہ بلبلا کر دعا مانگ رہا تھا۔

یہ کیفیت ہے ان قوموں کی جن میں خدا کا نام ہی نام رہ گیا ہے اور حقیقت مٹ گئی ہے۔ ان کے مقابلہ میں مسلمان ہیں جن کا زندہ خدا ہے اور جو زندہ رسول کے ماننے والے ہیں اور جو آج بھی خدا کے فضلوں کے اسی طرح وارث ہو سکتے ہیں جس طرح پہلے ہوئے مگر نہ انہیں خدا کی طرف توجہ ہے نہ اس کے رسول کی طرف اور نہ اس قرآن کی طرف۔ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ پر عمل کرنا تو الگ رہا یعنی یہ کہ وہ تبلیغ کریں ان کی اپنی حالت ایسی ہے کہ اسلام سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی بعض خطاؤں اور غلط کاریوں کی وجہ سے یہ وبال ان پر ڈال رکھا ہے۔ ورنہ سمجھ میں نہیں آتا جھوٹے مذاہب والوں میں تو اپنے اپنے مذہب کے لئے ایسی قربانیاں اور ایسے ایثار دکھانے والے پیدا ہوں مگر مسلمانوں میں نہ ہوں جنہیں خدا تعالیٰ نے قرآن ایسی کتاب دی جس کا مقصد اور مدعا ہی اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ ہے۔

دوسری بات اس آیت میں رسول کریم ﷺ کی طرف سے یہ بیان کی گئی ہے کہ میں اور میرے متبع عقل اور دلیل پر چلتے ہیں مگر اب نظر یہ آتا ہے کہ مسلمان ہی عقل اور دلیل کو سب سے زیادہ چھوڑنے والے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے علماء کے پاس اگر کوئی چیز باقی رہ گئی ہے تو صرف روایت۔ رسول کریم ﷺ تو فرماتے ہیں۔ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ مگر یہ کہتے ہیں فلاں نے یہ بات لکھی ہے خواہ وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے ہم اس کو مانیں گے۔ خدا اور خدا کا رسول تو ایمان کی بنیاد عقل اور دلیل پر رکھتا ہے اور رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں میں ہی عقل اور دلیل پر قائم نہیں ہوں بلکہ جو بھی میرا سچا متبع ہو گا وہ اپنے ایمان کو عقل اور دلیل پر قائم کرے گا وہ کبھی یہ نہ کہے گا کہ فلاں نے یوں کہا ہے اس لئے میں فلاں بات مانتا ہوں بلکہ وہ یہی کہے گا عقل اور دلیل سے مجھے یہ بات معلوم ہو گئی ہے اس لئے مانتا ہوں۔ پس مؤمن یہ حریت اور آزادی دکھاتا ہے۔ وہ سارے واسطے مٹا دیتا اور براہ راست خدا تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ یہی ایک سچے مؤمن کی شان ہے ہم مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے درمیان کوئی واسطہ نہیں حتیٰ کہ رسول جو سب سے بڑی چیز ہے اسے بھی ہم واسطہ نہیں سمجھتے کیونکہ ہم مشرک نہیں۔ رسول کریم ﷺ ہمارے ہادی اور راہ نما ہیں مگر ہمارے اور خدا تعالیٰ کے درمیان بند دروازہ نہیں ہیں بلکہ کھلا دروازہ ہیں تاکہ ہم اس دروازہ میں سے گذر کر خدا تعالیٰ تک پہنچ جائیں۔

اس بات کو بیان کرنے کے لئے زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے لیکن اس خطبہ سے دور چلا جاؤں گا اگر میں اس تفصیل کو بیان کروں- ہاں اتنا بتا دیتا ہوں کہ ہم میں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں میں یہ فرق ہے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے رستہ میں دربان مقرر کئے ہوئے ہیں- وہ کہتے ہیں ان سے ٹکٹ حاصل کرو تو آگے جا سکتے ہو مگر اسلام یہ کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ہر ایک کے لئے دروازہ کھلا ہے اور رسول ﷺ کا کام یہ ہے کہ بھولے بھٹکوں کو پکڑ پکڑ کر اس دروازہ کی طرف لائے- یہ ہے نبوت کے متعلق اسلامی تعلیم اور یہ ہے اسلام اور دوسرے مذاہب میں فرق-

توباوجود اس کے کہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں میں اور میری جماعت بصیرت پر قائم ہیں اس زمانہ کے علماء مسلمانوں کو پرانے لوگوں کے افکار و حوادث کا ان کے خیالات کا اور ان کی روایات کا غلام بنائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں- پھر مسلمانوں کی روایات کا ہی نہیں یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات کا بھی غلام بنا رکھا ہے- خدا کے نبیوں اور فرشتوں کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات کی بناء پر ایسی ایسی باتیں تفسیروں میں لکھی ہیں جن کو کوئی شریف انسان پڑھ بھی نہیں سکتا مگر ان کے متعلق کہتے ہیں مسلمانوں کو ماننی چاہئیں کیونکہ تفسیروں میں لکھی ہیں- فرشتے جن کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے- يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (النحل : ۵۱) جو کچھ انہیں کہا جائے وہی کرتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں کرتے- ان کی نسبت لکھا ہے کہ آسمان سے آدمی بن کر اترے تھے اور ایک کنچنی پر عاشق ہو گئے تھے اب بابل میں لٹکے ہوئے ہیں- یہودیوں کی کئی کتابوں میں لکھا ہے کہ فرشتے بھی گناہ کر سکتے ہیں مسلمانوں میں تو یہ جائز نہیں- اسی طرح عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے سوا کوئی انسان پاک نہیں اس وجہ سے انہوں نے ایسی روایتیں گھڑ لیں جن میں سب انبیاءؑ کو گناہ گار ٹھہرایا گیا ان کو مسلمانوں نے لے کر کہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر الزام لگا دیا کہیں اور انبیاءؑ پر حتیٰ کہ رسول کریم ﷺ کی ذات پاک پر الزام لگانے سے بھی باز نہ آئے-

خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ دوسرا گُر بتایا تھا مگر اس کی طرف بھی انہوں نے توجہ نہ کی- بہت کم مسلمان ہوں گے جو قرآن کریم پر غور اور تدبر کرتے ہوں گے- اگر مسلمان قرآن کریم پر تدبر کریں تو انہیں ایسی باتیں معلوم ہو جائیں کہ جن کے ذریعہ وہ ترقی کر سکتے ہیں بشرطیکہ پرانی اور غلط اور بے ہودہ روایات کے ماتحت غور نہ کریں- جس طرح عمدہ کھانے میں تھوڑی

سی خراب چیز مل جانے سے سارا کھانا خراب ہو جاتا ہے۔ جس طرح بہت سے دودھ کو پیشاب کا ایک قطرہ خراب کر دیتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کے کلام کے ساتھ بے ہودہ انسانی کلام ملانے سے حقیقت چھپ جاتی ہے۔

ان دو باتوں کی طرف جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں اگر مسلمان توجہ کریں تو ترقی کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے رستہ میں دیکھتے ہیں قرآن کبھی روک نہیں بنا جو چیز روک بنتی ہے وہ یہی ہے کہ فلاں نے یہ لکھا ہے اور فلاں نے یہ۔ ہمارا خیال ہے اور خیال ہی نہیں اپنا تجربہ ہے کہ اگر مسلمان قرآن کریم پر غور کریں تو یقیناً اس نقطہ پر آسکتے ہیں جہاں خدا مل جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ ہمیں قرآن کریم سمجھنے کی توفیق دے اور اُدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ میں جو مقصد بتایا گیا ہے اور جو خدا تعالیٰ سے محبت کرنا اور اس کی طرف لوگوں کو بلانا ہے اسے پورا کریں۔ ہم قرآن کو اندھا دھند نہ مانیں تاکہ ہمارے افعال بھی اسی طرح ورثہ کے نہ ہوں جیسے عیسائیوں اور یہودیوں کے ہیں۔

(الفضل ۱۱/ اگست ۱۹۲۸ء)

۱۔ الناس: ۲ تا ۷ ۲۔ الفلق: ۲

۳۔ عمر فاروق اعظم مصنفہ محمد حسین ہیکل مترجم حبیب اشعر صفحہ ۳۰۱-۳۰۲ مطبوعہ مکتبہ جدید (میکلوڈ روڈ) لاہور۔